ساتھ آتا' امانت کو شاکر صاحب کے سپرد کرتا اور واپس چلا جاتا۔ مگر وہ بھی ایک دن شاکر صاحب کو داغ مفارقت دے گیا۔ شاید اکیلے گھر میں اسے خفقان ہوا اور کیا عجب ہے کہ اسے احساس ہو گیا ہو کہ اس گھر پر تو تنہائی کی زندگی کا سایہ ہے۔ تجرد کی زندگی سے پریشان ہو کر یہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ جوئندہ پائندہ' جلد ہی ایک رفیقہ اسے میسر آ گئی۔

''شاکر صاحب' آپ کا سیزر کہاں غائب ہو گیا۔''

بولے ''ایک مرتبہ وہ آیا تھا۔ ایک کتیا اس کے ساتھ تھی۔ بہت اس نے دم ہلائی' مگر میں نے اسے منہ نہیں لگایا۔ چلا گیا۔ پھر نہیں آیا۔''

مجھے یقین ہے کہ اس گھر سے نکل کر سیزر نے بھونکنا بھی شروع کر دیا ہو گا۔ گم سم شاکر علی کی صحبت میں رہ کر تو وہ بھونکنا ہی بھول گیا تھا۔ شاکر صاحب بولتے بھی تھے تو شارٹ ہینڈ میں۔ فقرہ بالعموم ادھورا رہتا تھا۔ مطلب کو آپ سمجھیں اور فقرے کو مکمل خود کر لیں۔ بولنے کی خواہش سے ویسے تو بے نیاز ہی تھے۔ وہ سنا کریں اور کہا کرے کوئی' مگر وقتاً فوقتاً بولنے کی خواہش بھی زور مارتی تھی۔ اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا۔ ایک واقعہ تو مجھے ذاتی حوالے سے یاد ہے۔ میرے ایک افسانوی مجموعے کی افتتاحی تقریب تھی۔ کس شوق سے دوستوں نے اس تقریب کا انہیں صدر بنایا۔ خود شاکر صاحب نے ایک لمبی صدارتی تقریر کا عزم باندھا تھا مگر جب مائیک کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو جلدی جلدی ڈھائی تین فقرے ایسے بولے کہ کوئی آدھا کوئی پونا اور سٹپٹا کر بیٹھ گئے۔

مکمل فقرے تو میں نے ان کی زبان سے ادا ہوتے ایک ہی موقعہ پر دیکھے تھے جب انہیں زاہد ڈار کی ایک بات پر غصہ آیا تھا۔ زاہد ڈار جب پیروں فقیروں کو نہیں بخشتا تو ادیب اور دانشور کس گنتی میں ہیں۔ سو ایک دن رو میں سبط حسن کی شان میں بھی اس نے کچھ کہہ ڈالا۔ شاکر صاحب بھڑک اٹھے۔ ''تمہیں پتا ہے کہ سطے میرا دوست ہے۔ تم نے کیسے کہی یہ بات اس کے بارے میں۔ نکل جاؤ یہاں سے۔'' اور اس رو میں کتنے ہی مربوط فقرے ایک تسلسل میں بولتے چلے گئے' مگر زاہد ڈار ایک ڈھیٹ۔ اطمینان سے اپنی جگہ جما بیٹھا رہا اور جب فخر الدین آملیٹ اور توس لے کر آیا تو اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ شاکر صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کریں۔ بس منہ لپیٹ کر پڑ گئے۔

شاکر صاحب کو سبط حسن سے واقعی بہت لگاؤ تھا۔ بہت پکی دوستی تھی۔ ایسی پکی کہ ایک مرتبہ ان کی خاطر وہ اچھے خاصے مولائی بن گئے تھے۔ وہ عاشور کی دوپہر تھی۔ میں' ناصر اور مشتاق ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے انیس کی ایک جلد ہمارے بیچ رکھی تھی۔ مظفر کی فراہم کردہ اس جلد کو مشتاق نے ان تاریخوں میں کس خضوع و خشوع سے پڑھا تھا۔ اچانک شاکر صاحب وارد ہوئے۔ نہ دعا نہ سلام ''اٹھو اٹھو یار' ہمارے گھر چلو مجلس کرنی ہے۔''

''مجلس؟'' ہم تینوں نے شاکر صاحب کو تعجب سے دیکھا۔

''ہاں یار سبطے میرے گھر بیٹھا ہے۔ کہتا ہے آج عاشور کا دن ہے۔ کچھ ماتم مرثیہ ہونا چاہیے۔ یار تم لوگوں کو کوئی مرثیہ ورثیہ یاد ہے۔ کوئی سوز' کوئی نوحہ۔''

مشتاق بولا ''انیس جو موجود ہے۔''

شاکر صاحب نے انیس کی جلد کو دیکھا ''بس بس کام بن گیا۔ اٹھو چلو جلدی سے۔''

سو ہم شاکر صاحب کے یہاں پہنچے۔ سبط حسن وہاں سچ مچ محرمی صورت لیے بیٹھے تھے۔ مراثی انیس کی جلد اس وقت انہیں بہت بڑی نعمت نظر آئی۔ کس رقت بھری کیفیت میں انہوں نے سوز خوانی شروع کی۔ بازو کے طور پر دائیں احمد مشتاق اور بائیں خورشید شاہد۔

بعد میں ایک گفتگو میں سبط صاحب نے مجھے بتایا کہ شروع عمر میں انہوں نے بہت سوز خوانی کی ہے اور یہ کہ وہ بہت اچھے سوز خواں تھے۔ یہ سن کر مجھے افسوس ہی ہونا تھا۔ اتنا اچھا سوز خواں مفت میں انقلاب کی نذر ہو گیا۔ کچھ ایسا ہی افسوس مجھے اس وقت ہوا تھا جب علی سردار جعفری کے مرثیوں کے کچھ اقتباسات میری نظر سے گزرے تھے۔ قدرت نے انہیں مرثیہ گو پیدا کیا تھا۔ انہوں نے ساری صلاحیت کو انقلابی نظموں کی راہ ضائع کر دیا اور لیجئے مجھے ایک اور انقلابی دوست یاد آ گیا' جس نے ایک پورا موسم عزا مولائی بن کر گزارا۔ یہ تھے اپنے صفدر میر۔ انہی دنوں جن دنوں مظفر علی سید کی فراہم کردہ مراثی انیس کی چار جلدیں ہم دوستوں کے درمیان گردش کر رہی تھیں صفدر کے ہاتھ میں ایک کتاب بہت نظر آتی تھی ''A Hero With A Thousand Faces'' ان دنوں جوزف کیمبل زیر مطالعہ تھا اور جب چائے کی میز پر مل کر بیٹھے تو صفدر کی طرف سے ایک سوال اٹھتا۔ اسلامی روایت کے پاس کوئی متھ (MYTH) نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے۔

میں نے ایک روز جل کر کہا کہ ''صفدر صاحب' آپ نے بہت شاعری پڑھی ہے' ذرا کبھی انیس کو بھی پڑھ کر دیکھئے' پھر بات ہو گی کہ اسلامی روایت کے دامن میں کوئی متھ ہے یا نہیں ہے۔''

جواب میں صفدر صاحب نے مشتاق کے ہاتھ سے انیس کی جلد کو اچکا۔ فوراً ہی اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ''یہ مجھ سے کل لے لینا۔''

اس کے بعد دوسری جلد۔ پھر تیسری جلد۔ پھر چوتھی جلد اور اب محرم کا بیچ تھا۔ شاید صفدر صاحب نے ان دنوں ایک دو مجلسوں میں بھی شرکت کی تھی۔ بہر حال شب عاشور ہماری پوری ٹولی ٹی ہاؤس سے نکلی اور موچی دروازے پہنچی۔ وہ ساری رات ہم نے اسی کوچہ

عزا میں گزاری۔ ہر عزا خانے میں جھانکا' ہر سبیل پر شربت پیا۔ حویلی قزلباس سے جب جلوس ذوالجناح برآمد ہوا تو ماتمیوں میں رلے ملے ہم بھی چل رہے تھے۔ صبح کی اذان ہونے لگی تو جلوس تھم گیا۔ نوحہ ماتم یکسر موقوف اور یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ صبح عاشور کی اذان سے ایک پوری روایت وابستہ ہے جس نے اس اذان کو خاص معنویت دے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ یہ اذان حضرت علی اکبر نے دی تھی جو ہمشکل نبی تھے اور جن کی آواز بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی آواز سے مشابہ تھی۔ اس مضمون کو مرثیہ خوانوں نے خاص طور پر انیس نے اپنے اپنے رنگ سے باندھا ہے۔

''علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے''

تو اذان ہو رہی تھی۔ ماتمی خاموش کھڑے تھے۔ کسی کسی نے گریہ شروع کر دیا تھا۔ اذان ختم ہوتے ہی زنجیر زن ماتمیوں نے حلقہ بنایا' نوحہ شروع کیا اور زنجیروں کا ماتم شروع ہو گیا۔ پنجابی نوحہ تھا۔ مضمون وہی کہ

''علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے''

صفدر صاحب نے کھڑے کھڑے ایک دم جھرجھری لی۔ قمیص اتار کر اس طرح پھینکی کہ میرے منہ پر آ کر پڑی اور زن سے ماتمیوں کے حلقہ میں اور پتا نہیں کب کس طرح کس سے انہوں نے زنجیر حاصل کی۔ گھڑی بھر میں ان کی برہنہ پشت لہولہان ہو گئی۔ شاید صفدر صاحب کو اسلامی روایت میں وہ شے مل گئی تھی جس کی انہیں تلاش تھی۔

اگلے محرم کے آتے آتے ہماری وہ صحبت ہی بکھر گئی۔ سو پھر موچی دروازے کا رخ ہی نہیں کیا' مگر پھر تھوڑے برسوں بعد ہمارے ایک اور دانشور دوست کو یاد آیا کہ فیض صاحب دو کام پابندی سے کرتے ہیں' عید کی نماز اور موچی دروازے میں شب عاشور۔ عذر یہ ہے کہ یہ تو ہمارا کلچر ہے تو اس دوست نے تقاضا کیا کہ چلو ہمارے ساتھ موچی دروازے۔ یہ تھے اعجاز حسین بٹالوی۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر کتنے برسوں تک یہ رسم ادا کی بلکہ عزا خانوں میں جا کر ان کے ساتھ اگربتی موم بتی بھی سلگائی تا آنکہ وہ بھٹو کے مقدمے میں الجھ گئے اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اصل میں میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے تو جتنا ماتم مرثیہ کرنا تھا وہ میں نے بچپن لڑکپن میں کر لیا' اب ایک زمانے سے فارغ چلا آتا ہوں' لیکن اگر کوئی داشور دوست اس راہ کی طرف کھنچتا دکھائی دے' کلچر' متھ' کسی بھی واسطے سے سہی میں چار قدم اس کے ساتھ ضرور چلتا ہوں۔ اس کا ثواب تو مجھے ملتا ہوگا۔ لیجئے ثواب پر مجھے اپنے دوست پروفیسر سجاد رضوی کا ایک خواب یاد آ گیا۔ سجاد رضوی ٹی ہاؤس اور حلقہ ارباب ذوق کی مخلوق تھے۔ غزلیں لکھیں' تنقیدی مضامین لکھے' ''صحیفہ'' کی اڈیٹری کی۔ اب ذاکر حسین ہیں۔ مجلس

خوب پڑھتے ہیں' مگر عزاداروں کو ان سے شکایت ہے کہ رلاتے نہیں۔ ہاں تو ایک وقت میں انہوں نے مجھے واقعہ کربلا کے حوالے سے ایک کتاب لکھنے پر اکسایا تھا۔ اسی ہنگام انہوں نے ایک خواب دیکھ لیا۔ اب خواب کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیسے وارد ہوتے ہیں بس وارد ہو جاتے ہیں۔

''مولانا'' میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ جیسے میں ایک مزار کے سرہانے کھڑا ہوں۔ خیال کچھ اس طرح کا کہ جیسے یہ امام کا مزار ہے۔ مزار کے اندر سے ایک ہاتھ نکلا۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ لاؤ' وہ انتظار حسین کی کتاب کہاں ہے؟''

بات آئی گئی ہوئی' مگر چند دنوں بعد موصوف آئے۔ کہا کہ ''مولانا میں نے وہ خواب پھر دیکھا ہے۔ پھر اسی طرح سے مزار سے ہاتھ نکلا ہوا ہے اور وہی آواز کہ انتظار حسین کی کتاب کہاں ہے۔''

میں نے سوچا' پھر سجاد رضوی سے کہا کہ ''اصل میں جس کتاب کا مولا کی طرف سے تقاضا ہے وہ وہ نہیں جو تم لکھوانا چاہتے ہو بلکہ اس ناول کے لیے ہے جو میں ''بستی'' کے نام سے لکھ رہا ہوں۔ واقعی اس میں تاخیر ہو گئی ہے۔ اب جلدی مکمل کرتا ہوں اور چھپواتا ہوں۔''

لو میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ذکر شاکر صاحب کا تھا۔ میں بتا رہا تھا کہ شاکر صاحب ان دنوں بھائیں بھائیں کرتے پرنسپلز ہاؤس میں اکیلے منہ لپیٹے پڑے رہتے۔ کوئی دوست آ جاتا تو منہ پر تھوڑی رونق آ جاتی۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہوں نے ایک گھر دیکھ لیا۔ کشور ناہید کا گھر۔ کشور ناہید سے دوستی بڑھی تو منہ پر رونق نظر آنے لگی اور اب لازم نہیں تھا کہ شاکر صاحب اپنے خانہ ویران ہی میں بیٹھ کر دوستوں کا انتظار کریں۔ آخر کشور کا گھر بھی تو تھا جواب ماشاء اللہ بہت تیزی سے مرجع اہل ذوق بنتا جا رہا تھا۔ اب شاکر صاحب کا ٹھکانا یہ گھر تھا۔

مگر ایک شام اچانک شاکر صاحب کشور کے گھر جانے کے بجائے ٹی ہاؤس آ گئے۔ بہت دل گرفتہ تھے۔ رفتہ رفتہ کھلے۔ کشور کے یہاں جو کچھ بھی ہوا بہر حال اس کے سلوک سے نالاں تھے۔ احمد مشتاق کو ایسا موقعہ خدا دے۔ شاکر صاحب جو خود کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہیں پا رہے تھے وہ بطرز احسن مشتاق نے کہا اور شاکر صاحب کو سمجھایا کہ اب تو آپ نے دیکھ لیا کہ وہ بی بی عزت داروں سے کیا سلوک کرتی ہے۔ سو اب اس گھر جانے سے توبہ کرو اور شاکر صاحب نے کان پکڑے اور توبہ کی۔

تو اب روز شام کو شاکر صاحب ٹی ہاؤس آ جاتے اور وہی ہمیشہ والا طریقہ کہ جس کی طرف سے دل پر میل آ جاتا اس کے خلاف خود آدھا فقرہ بولنا' باقی کا کام یاروں پر چھوڑ دینا جسے وہ تہہ دل سے انجام دیتے۔ یہاں مشتاق کے لیے ان کا بولا ہوا آدھا فقرہ بہت تھا۔ وہ بیان اس طرح مکمل کرتا کہ شاکر صاحب سمجھتے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ یوں مشتاق کی زبان کی راہ مشتاق کے ساتھ

شاکر صاحب کے دل کا بھی غبار نکل جاتا اور مشتاق مطمئن کہ اب شاکر صاحب اس کوچہ میں نہیں جائیں گے۔

مگر ہوا یوں کہ روز شام کو آتے آتے ایک شام شاکر صاحب ٹی ہاؤس نہیں آئے' پھر دوسری شام بھی نہیں آئے' پھر جب تیسری شام بھی نہ آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کہا کہ مشتاق شاکر صاحب لگتا ہے پھر اس طرف ہو لیے۔ مشتاق نے کھوج لگایا اور ہمارا شک درست نکلا۔

دنوں بعد جب شاکر صاحب ٹی ہاؤس آئے تو مشتاق نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ شاکر صاحب سنتے رہے' سنتے رہے پھر بے وقوفانہ سی ہنسی ہنسے اور اپنی صفائی میں بولے "یار' وہ کوفتے بہت اچھے بناتی ہے۔"

مشتاق کے سارے طعنے ایک طرف اور یہ بیان صفائی دوسری طرف۔ میں نے ابھی تک کشور کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کوفتے نہیں کھائے تھے' اس لیے میں بھی کیا کہہ سکتا تھا۔ خیر آگے چل کر وہ میں نے کھائے۔ اس کے سوا میں کہہ سکتا ہوں کہ کھانے کا معاملہ بھی حسن کا سا ہے کہ کچھ صاحب حسن میں ہوتا ہے کچھ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ ذائقہ آدھا کھانے میں ہوتا ہے' آدھا کھانے والے کی زبان اور تالو میں ہوتا ہے۔ وہ یار بھی تو تھے جو اس دسترخوان پر سجی ہوئی قدردانوں کی طرف سے آئی ہوئی ڈش کو بھی کشور کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہنڈیا گردانتے اور ہونٹ چاٹتے تھے۔ اصل میں یہ کشور کے چولہے کی برکت اور ہاتھ کی لذت تھی کہ جو ڈش اس سے منسوب ہو گئی اس میں ایک نرالا سواد پیدا ہو گیا۔ بہر حال کچھ تو تھا کہ یہ دسترخوان پھیلتا چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ کرشن نگر کا گھر چھوٹا پڑ گیا۔ پھر کشور کو اس دم بدم پھیلتے دسترخوان کی خاطر اقبال ٹاؤن جا کر نیا گھر تعمیر کرنا پڑا۔ پھر تو یوں لگا کہ شہر میں اگر کوئی گھر ہے تو کشور کا گھر ہے اور کوئی دسترخوان ہے تو کشور کا دسترخوان ہے۔ الف لیلیٰ کی ایک کہانی میں خلیفہ ہارون رشید کا ذکر یوں آیا ہے کہ وہ روز شام کو بھیس بدل کر بغداد کے اس دروازے کی طرف نکل جاتا جس دروازے سے مسافر شہر میں داخل ہوتے وہ کسی ایک مسافر کو اپنے مہمان کے طور پر پسند کرتا اور محل میں لا کر اس کی تواضع کرتا۔ کشور کو بھی اپنے وقت کی خلیفہ ہارون رشید سمجھو۔ مسافر نواز ایسی کہ کسی مسافر کو دعوت کے بغیر شہر سے واپس نہیں ہونے دیا۔ شروع میں ضرور اس نے مسافر تلاش کیے ہوں گے' مگر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ مسافر کو لاہور میں قدم رکھنے کے بعد خود ہی پتا چل جاتا تھا کہ شجر سایہ دار کہاں ہے۔ وہ خود ہی سونگھتا سونگھتا اس در پہ پہنچ جاتا تھا۔ مسافر کے نام چوہے کا بچہ بھی لاہور میں داخل ہو جاتا تو کشور اسے آنکھوں پہ بٹھاتی اور کس کس قماش کا مسافر کس کس نگر سے کھنچ کر یہاں پہنچتا اور سیدھا جا کر کشور کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتا۔ اب تو لگتا تھا اور مسافروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس دسترخوان کی مہک ادھر نہر سویز کو عبور کر کے اور ادھر واہگہ کو پار کر کے کس کس دیس تک گئی ہے۔ ایک دو دفعہ اسلام آباد گیا تب بھید کھلا کہ مسافر کیوں اب لاہور کا رخ

نہیں کرتا۔ لاہور کا پانی تو اسلام آباد بہہ گیا۔ مسافروں کا رخ اب اس نگر کی طرف ہے۔

لیجئے خلیفہ ہارون رشید کا حوالہ آیا تو مجھے کشور کی ایک اور شاہانہ نسبت یاد آ گئی۔ اس نسبت کے انکشاف سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ ''مشرق'' کی کالم نگاری کے زمانے میں میرا شہر کے نجومیوں سے اچھا خاصا ربط وضبط تھا۔ مال کے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا ایک نجومی تو اپنے نجوم سے زیادہ میرے کالم کی تاثیر کا قائل ہو گیا تھا۔ ایک روز دفتر آیا اور نوٹوں کی ایک گڈی میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔

''انتظار صاحب جی، بہت دن ہو گئے، ایک کالم اور لکھ دیں، آج کل کام مندا جا رہا ہے۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو بولا ''صاب جی، اس ویلے تو میرے پاس اتنی ہی رقم تھی۔ کالم کے بعد کام ذرا چمکے گا تو پھر اور خدمت کروں گا۔''

ایک نجومی صاحب پنڈی میں تھے جو غازی منجم کہلاتے تھے۔ غازی صاحب وقتاً فوقتاً مجھے اپنی پیش گوئیوں سے نوازتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی طرف سے مجھے ایک عجب زائچہ موصول ہوا۔ یہ کشور کا زائچہ تھا۔ زائچہ میں بتایا گیا تھا کہ اس نیک ساعت میں جب کشور بحالت عدم رحم مادر میں آئی تو زحل مشتری کے قریب آتے آتے چار درجے کے فرق پر رہ گیا تھا۔ اگر زحل نے یہ چار درجے بھی عبور کر لیے ہوتے تو کشور ناہید کو صاحب قرآن کا مرتبہ حاصل ہو جاتا۔

ہماری تاریخ میں دو صاحب قرآن گزرے ہیں۔ صاحب قرآن اول امیر تیمور، صاحب قرآن ثانی شاہجہان بادشاہ۔ ایک نے کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کیے۔ دوسرے نے تاج محل تعمیر کیا۔ کشور صاحب قرآن ثالث بنتے بنتے رہ گئی۔ پتا نہیں اس صورت میں وہ کیا گل کھلاتی۔ بہرحال اب صورت یہ ہے کہ اس کے یہاں یہ دونوں شوق جلالی اور جمالی چار درجہ کے فرق کے ساتھ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ حسرت تعمیر اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انتھک کام کرتی ہے جس کام کو ہاتھ لگاتی ہے، جس دفتر میں جا کر بیٹھتی ہے اسے اس کے ذوق عمل سے چار چاند لگ جاتے ہیں، مگر عملہ کی کمبختی آ جاتی ہے۔ سو کشور کے ذوق تعمیر کے ساتھ وہیں کہیں آپ کو ایک چھوٹا موٹا کھوپڑیوں کا مینار بھی کھڑا نظر آئے گا۔

غازی صاحب نے چار درجوں کے فرق کو دور کرنے کا ایک نسخہ تجویز کیا تھا۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ کشور ناہید سے کہو کہ وہ بطخوں کا ایک جوڑا پال لے۔ اس کے اثر سے چار درجوں کا یہ فرق دور ہو سکتا ہے۔ میں نے ازراہ مصلحت کشور کو یہ نسخہ نہیں بتایا۔ وجہ ظاہر ہے مجھے دو کھوپڑیاں بہت عزیز تھیں، شاکر علی کی کھوپڑی اور زاہد ڈار کی کھوپڑی۔

غازی منجم کا کہنا کہ کشور کے جتنے ستارے ہیں وہ سب مذکر ہیں۔ سیارہ بہرام مذکر' زحل مذکر' مشتری مذکر' اور اس سے اس منجم نے یہ نتیجہ نکالا کہ کشور کی چال ڈھال' بات چیت اور جملہ خواص خالصتاً مذکر ہیں' البتہ جسمانی بناوٹ مونث ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کشور اپنی جسمانی بناوٹ سے مار کھا گئی۔ سمجھ لیجئے کہ یہاں بھی چار درجہ پیچھے رہ گئی ورنہ کامل مذکر ہوتی اور پوری امیر تیمور۔ مگر صاحب آدمی کامل کہاں ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی کسر رہ جاتی ہے۔ امیر تیمور کہاں کا کامل تھا اور نہیں تو اس کی ٹانگ میں نقص پیدا ہو گیا۔ یہاں صیغہ میں تھوڑی کسر رہ گئی۔

مگر شاید یہ بھی وقت کی ضرورت تھی۔ یہ کشور کے مذکر ستاروں ہی کا تو فیضان ہے کہ وہ آزادی نسواں کے لیے اتنی مردانہ وار لڑ رہی ہے۔ تحریک آزادی نسواں کی جو دوسری فعال کارکن ہیں شاید ان سب ہی کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ستاروں میں مذکر ستارے زیادہ ہیں۔ ان ستاروں کے زور پر وہ آزادی نسواں کے معاملہ کو آگے دھکیل رہی ہے۔ یہ آگے دھکیلنے کی بات میں نے کشور ہی کی معرفت بریخت سے مستعار لی ہے۔ ''فتنہ سامان دل'' کی تقریب میں اسلم اظہر تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے بریخت کے کھیل سے ایک مکالمہ نقل کیا۔ پادری صاحب گیلی لیو سے کہتے ہیں کہ سچ اگر سچ ہے تو وہ اپنی راہ خود کیوں نہیں بناتا۔ گیلی لیو جواب دیتا ہے کہ سچ اتنا ہی آگے بڑھتا ہے جتنا ہم اسے آگے دھکیلتے ہیں۔ اسلم اظہر کا مطلب یہ تھا کہ کشور اپنی شاعری سے سچ کو آگے دھکیل رہی ہے۔ مگر کشور بے چین روح ہے۔ اس نے دیکھا کہ شاعری اس معاملہ میں ہیٹی ہے۔ اس کے ذریعہ سچ کو زیادہ آگے نہیں دھکیلا جا سکتا۔ تب وہ نثر میں رواں ہوئی۔ نثر کی کارکردگی سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو سیدھی میدان عمل میں کود پڑی اور ویمن ایکشن فرنٹ میں جت گئی۔ اس وقت سے نسوانی سچ کو بڑی تیزی سے آگے دھکیل رہی ہے۔

کشور عورتوں کی آزادی کی بہت بڑی علمبردار ہے۔ اس مقصد سے مردوں سے لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ مگر مردوں کی بھی وہ دشمن نہیں ہے۔ مفید مشوروں سے انہیں بھی نوازتی ہے۔ مجروح سلطان پوری لاہور مشاعرہ پڑھنے آئے تو تنت وقت پہ ایک مشورہ دیا۔ کان میں کہا کہ مجروح صاحب' یہ فیض کا شہر ہے' یہاں گل و بلبل والی غزل نہیں چلے گی۔ اسے کراچی کے لیے اٹھا رکھئے۔ یہاں کوئی دار و رسن والی غزل سنائیں۔ مگر مجروح صاحب نے اس مشورے پر عمل کرنے کو اپنی مردانہ غیرت اور شاعرانہ انا کے خلاف جانا۔ ہر پھر کر گل و بلبل والی غزلیں ہی پڑھیں۔ نتیجہ یہ کہ فلاپ ہو گئے۔

اس میں کشور کی کیا خطا تھی۔ اس نے تو مجروح صاحب کے ساتھ ہمدردی کی تھی اور پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ کشور میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دوستوں کی دوست نہیں بھی ہو تو مشکل کے وقت دوست بن جاتی ہے بلکہ مشکل ہی کے وقت دوست بنتی ہے۔ یہی تو مشکل ہے کہ کشور کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے آدمی کو کوئی نہ کوئی مصیبت مول لینی پڑتی ہے۔

آسان طریقہ یہ ہے کہ بیمار پڑ جاؤ۔ گلدستہ تو خیر بیماری کے پہلے ہی دن پہنچ جائے گا۔ بیماری کے دوران گلدستہ پہنچنا اور شفایابی پر کیک کا ٹنا یہ تو معمول کی بات ہوئی۔ اصل کشور ناہید اس وقت اپنا چہرہ دکھاتی ہے جب ادیب اس طرح بیمار پڑے کہ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہ ہوں۔ بس پھر کشور سرگاڑی پیر پہیہ ایک کر دیتی ہے اور پھر روپوں کی تھیلی مریض کے سرہانے ہوتی ہے اور ہسپتال کے بڑے ڈاکٹروں کی توجہ خاص اسے حاصل ہوتی ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ادیب شفایاب ہو جاتا ہے اور شفایاب کا کیک کٹ جاتا ہے' کیونکہ اس کے فوراً بعد ہی شفایاب ادیب کے تعلقات کشور سے کشیدہ ہو جاتے ہیں' جیسے شفا پانے کے بعد حبیب جالب سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ خوش حال اور صحت مند ادیب کشور کو وارا نہیں کھاتے اور چونکہ اب وہ زمانہ نہیں جب ادیب پریشان حال رہتے تھے اور بالعموم تپ دق کے مرض کا شکار ہو جاتے تھے۔ جب اس کمرشلزم کے زمانے میں وہ خوب کما رہے ہیں اور ماشاءاللہ ان کی صحتیں بھی اچھی ہیں' اس لیے بالعموم کشور کی ان سے اور ان کی کشور سے نہیں بنتی۔

اے لو میں دوستوں کا ذکر کیے چلے جا رہا ہوں اور ادھر حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں جنگ سر پہ تلی کھڑی ہے۔ دیواروں پہ' کاروں پہ جہاں دیکھو لکھا ہوا ہے۔ کرش انڈیا (Crush India) وہ رمضان کے دن تھے۔ ایک افطار پارٹی میں اپنی کالم نگاری کے واسطے سے شریک تھا۔ میرے برابر ''ڈان'' والے نثار عثمانی بیٹھے تھے۔ میرا یہ طور چلا آتا تھا کہ جب بھی ان سے مڈھ بھیڑ ہوتی تو قومی صورت حال کے بارے میں ان کی رائے مانگتا۔ استفسار کرتا کہ کیا ہو رہا ہے' کیا ہونے والا ہے۔ بس اسی قسم کی ایک ڈیڑھ بات اس وقت بھی ان سے ہوئی۔ مگر انہوں نے ساری بات چھوڑ کر اچانک مجھ سے ایک عجب سوال کیا ''انتظار صاحب' آپ نے ان دنوں کوئی خواب دیکھا ہے۔''

میں ہکا بکا کہ انہوں نے یہ کیا سوال کیا ہے۔ مگر پھر جلدی ہی میں نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور پھر جواب دیا ''ہاں دیکھا تو ہے۔''

''سنایئے' پھر میں آپ کو اپنا خواب سناؤں گا۔''

میں نے اپنا خواب سنایا۔ ان کا خواب سنا۔ پھر تعجب سے کہا کہ ''عثمانی صاحب' ان دونوں خوابوں میں کتنی مشابہت ہے اور دونوں ہی کچھ مہاجرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کی تعبیر آپ کیا کریں گے۔''

''تعبیر تو اچھی نہیں ہے۔ بس آپ دعا ہی کریں کہ پاکستان کسی طرح بچ جائے۔''

بس اسی آن افطار کا وقت ہو گیا۔ ہم کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ مگر اندر ہی اندر مجھے تھوڑی سی کرید تھی۔ میں نے کھاتے

کھاتے پوچھا ''عثمانی صاحب' آپ نے کسی اور سے بھی یہ سوال کیا ہوگا۔ وہاں سے کیا جواب آیا؟''

''نہیں' کسی سے نہیں کیا' نہ کسی کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا۔ بس اس وقت یونہی خیال آ گیا کہ آپ سے پوچھا جائے۔''

اور اب مجھے وہ تاریخی شام یاد آ رہی ہے جب میں مال روڈ پر چلتے چلتے ان کے دفتر کی طرف مڑ گیا۔ اس وقت آئی اے رحمن بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے وہی سوال کیا جو ان دنوں ہر کسی کی زبان پر تھا۔

''اس وقت آپ دو سیاسی مبصر جمع ہیں۔ یہ بتایئے کہ کیا واقعی جنگ ہوگی؟

نثار عثمانی خاموش رہے۔ رحمن صاحب نے بڑے تیقن سے کہا۔ ''نہیں'' اور پھر انہوں نے دلائل دینے شروع کیے۔

رحمن صاحب بڑی سیاسی سمجھداری کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ میں نے جب بھی جس محفل میں بھی انہیں سنا ان کے استدلال سے قائل ہو کر اٹھا۔ اس وقت انہوں نے بڑی تفصیل سے پوری صورت حال کا تجزیہ کیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ جنگ نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنی پیالی ختم کی' اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر جب میں نے اپنی گلی میں قدم رکھا تو کچھ لڑکے شور مچا رہے تھے ''جنگ بج گئی' جنگ بج گئی۔''

میں نے دل ہی دل میں تحقیر سے کہا کہ ان لڑکوں کی عمریں دیکھو اور ان کی جنگی جنون دیکھو۔ ان کا بس چلے تو واقعی جنگ شروع کرا دیں' مگر جب میں نے قدم رکھا تو دیکھا کہ عالیہ سخت پریشان بیٹھی ہیں۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''تمہیں پتا نہیں ہے' جنگ شروع ہو گئی ہے۔''

''جنگ شروع ہو گئی' کون کہتا ہے۔ یہ جو لڑکے باہر شور مچا رہے ہیں' ان کے کہنے میں آ گئیں۔''

''ریڈیو نے ابھی ابھی اعلان کیا ہے۔''

میں نے جلدی سے ریڈیو لگایا۔ جنگ کے سلسلہ میں شہریوں کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ بلیک آؤٹ شروع تھا۔ باہر سے آوازیں آ رہی تھیں ''لائٹ بجھاؤ' لائٹ بجھاؤ۔''

تو جنگ واقعی شروع ہو گئی ہے۔ میں نے بے بسی سے سوچا۔

◆◆◆

آدھا پاکستان نیا پاکستان

پاکستان ٹوٹ چکا تھا اور ناصر کاظمی ہسپتال میں پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ محفلوں اور صحبتوں کا رنگ اور سے اور ہو گیا تھا۔ پاکستان کونسل میں اب جو بھی جلسہ ہوتا' اس میں ہر پھر کر وہی ایک مسئلہ' وہی ایک تشویش کہ جنگی قیدی کب آئیں گے' کیسے آئیں گے؟ اب یہاں ایسی خواتین بڑی تعداد میں نظر آتی تھیں جو پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں۔ یہ اسیر فوجی اور سول افسروں کی بیویاں' بیٹیاں تھیں۔ مقرروں میں بھی وہی پیش پیش ہوتی تھیں۔ کتنے گھر اس سانحہ سے متاثر ہوئے تھے۔ میں کراچی گیا تو اپنی بہن کے گھر کا عجب نقشہ دیکھا۔ ہماری بہن صبح گھر سے نکلتیں اور سارا دن قریب کے امامباڑے میں ماتم مرثیے میں گزارتیں۔ ہمارے بہنوئی گھر میں جانماز پر بیٹھے وظیفے دعائیں پڑھتے رہتے۔ ہمارا بھانجا حسن ظہیر بریلی کیمپ میں رنج اسیری کھینچ رہا تھا۔ پاکستان کے اور بھی کتنے گھر ہوں گے جن کا کم وبیش یہی نقشہ ہوگا۔ کتنے اسیری کھینچ رہے تھے۔ کتنے گم تھے' کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس رستخیز بے جا میں مارے گئے یا بچ کر کہیں نکل گئے۔ نکلے تو کس طرف نکلے؟ نیپال کی طرف یا برما کی طرف۔

گھروں میں' محفلوں میں' جلسوں میں سوگ کی فضا تھی اور ناصر کاظمی کی حالت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ یکم مارچ 1972ء کو صبح منہ اندھیرے جب ابھی چڑیوں نے بولنا شروع کیا تھا' وہ درختوں اور چڑیوں کی اس دنیا سے سدھار گیا۔ پاکستان اور ناصر چند مہینوں کے فرق سے بس آگے پیچھے گئے یعنی وہ پاکستان جس میں' میں نے 1947ء کے آتے جاڑوں آ کر قدم رکھا تھا اور بنگالی جس کا جزو لاینفک تھے اور اس نئے ملک کی اکثریت تھے۔ اب جو پاکستان تھا' وہ تو بھٹو صاحب کے دیئے ہوئے نام کے مطابق نیا پاکستان تھا اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ ناصر جب ڈھاکہ اور ڈھاکہ کے آس پاس کی بستیوں میں گھوم پھر کر واپس آیا تو کتنا گرمجوش نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس ہری بھری دھرتی نے اس کے تخیل کو نئے سرے سے تازہ کر دیا ہے۔ ''یار'' وہ مجھی خوب آدمی تھا۔ کہنے لگا کہ ''جی میرا باپ مکھی تھا۔''

''مکھی۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''جی' ویسے تو وہ آدمی تھا۔ بس مکھی بن گیا۔''

''کیسے بن گیا؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا" پتہ نہیں چلا جی' کیسے بن گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مکھی بنا۔ بس کھڑا تھا۔ اچانک میرے دیکھتے ہی دیکھتے بن گیا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔"

ایسی کتنی باتیں اس نے مجھے جلدی جلدی سنا ڈالیں۔ یہ 1959ء کا ذکر ہے۔ رائٹرز گلڈ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ادیبوں کا ایک لمبا چوڑا قافلہ مشرقی پاکستان کے سفر پر روانہ ہوا۔ ناصر بھی اس قافلہ میں تھا۔ میں کوتاہ قدم نکلا۔ میرے قدم اس سفر پر نہیں اٹھے۔ ہاں پھر میں نے 1967ء میں پاکستان کونسل کی طرف سے وہاں کا پھیرا لگایا۔ ڈھاکہ اور راجشاہی کو چھوا اور آ گیا۔ اس وقت ڈھاکہ پاکستان کا شہر تھا اور مشرقی پاکستان کا صدر مقام۔ اب پچھلے برسوں میں سمجھ لیجئے کہ 1997ء میں ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے ڈاکٹر مبشر حسن کے قافلہ کے ساتھ اس دیار میں گیا تو ڈھاکہ اب بنگلہ دیش کی راجدھانی تھا۔ میں اس شہر میں اچھی طرح تو ایک ہی جوان کو جانتا تھا' غلام محمد کو یا ناول نگار شوکت عثمان سے سرسری تعارف تھا۔ ہاں ایک تیسری شخصیت بھی ہے مگر اس کا ذکر میں ذرا بعد میں کروں گا۔ غلام محمد کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب 1963-1962ء میں' میں ادب لطیف کی ادارت کر رہا تھا۔ اس عزیز کے افسانے پسند کر رہا تھا اور چھاپ رہا تھا۔ ملاقات اس سے میری 1971ء میں ہوئی' جب وہ اس پر آشوب زمانے میں کسی سرکاری کام سے لاہور آیا اور چلتے چلتے مجھ سے بھی ملا۔ مشرقی پاکستان میں دندناتی ہوئی مغربی پاکستانی مخلوق سے سخت برگشتہ تھا' نزلہ گرا غریب اردو پر۔

"میں نے طے کیا ہے کہ اب میں اردو میں نہیں لکھوں گا۔" اس نے اپنا یہ فیصلہ مجھے سنایا اور چلا گیا اور واقعی اس کے بعد اس کی کوئی اردو تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ اگرچہ اس قیامت کے گزر جانے کے بعد کتنے ہی خط مجھے موصول ہوئے مگر اس کے پاس ایسے ٹیڑھے سوال تھے جن کے جواب میرے پاس نہیں تھے۔ سو میں ہی جواب سے کنی کاٹ گیا۔ ڈھاکہ پہنچنے پر میں نے اسے تلاش کیا اور ملاقات کی۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ دل کو مرض لگا لیا تھا۔ بنگلہ میں بھی لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ بس انگریزی میں صحافت کرتا تھا۔ پہلے پاکستان سے خوش نہیں تھا' اب بنگلہ دیش سے ناخوش تھا۔ بتانے لگا کہ میں نے طے کیا ہے کہ بنگلہ دیش چھوڑ دوں اور امریکہ جا کر جہاں میرا بیٹا ہے' آباد ہو جاؤں۔"

غلام محمد نے میری ملاقات اپنے دوست فرہاد مظہر سے کرائی۔ فرہاد مظہر آگے مکتی باہنی کے سرگرم کارکن تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ان کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ اب ایک تحریک چلا رہے ہیں کہ بنگلہ زبان میں فارسی عربی کا جتنا بھی رنگ ہے' الفاظ اور تلمیحات ہی کے واسطے سے سہی' اسے فروغ دینا چاہیے کہ اس زبان کا اسلامی روایات سے رشتہ پختہ ہو۔

فرہاد مظہر اردو سے یکسر نا آشنا' مگر ان کی بیگم فریدہ اختر فر فر اردو بول رہی تھیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ دیکھئے میں ڈھاکہ آیا۔ آپ

دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ ایک ملاقات نہیں ہوسکی۔ شہید اللہ قیصر کی بیگم سے ملنا چاہتا تھا مگر ان کا مجھے اتا پتہ ہی نہیں ملا۔

''آپ پنا قیصر کو کیسے جانتے ہیں؟''

میں نے بتایا کہ اس خاتون کو میں نے کیسے جانا۔ کھٹمنڈو میں بھی ایسا ہی ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچا ہوا تھا۔ وہ بھی آئی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کی پیاری سی بیٹی شومی۔ 1971ء کے پرآشوب دنوں میں یہ المناک خبر تو ہم سب ہی نے اخباروں میں پڑھی تھی کہ ڈھاکہ میں بنگالی دانشوروں کی ایک پوری ٹولی کو اکٹھا قتل کر دیا گیا مگر اخبار میں واقعہ کو خبر کے طور پر پڑھنا ایک بات ہے لیکن جس پر بیتی ہو اس کی زبان سے سننا' اس کا اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے اور پھر پنا قیصر کا جذبات سے لبریزی بیان کہ کس طرح رات گئے ان کے دروازے پر دستک ہوئی اور کس طرح شہید اللہ قیصر کو لے جایا گیا اور کس طرح وہ شوہر کو ڈھونڈنے گھر سے نکلیں اور کہاں جا کر کس حال میں شوہر کو پایا۔ ''میری شادی کو ابھی دو سال ہوئے تھے اور شومی' شاید وہ گود میں تھی۔''

جب تقریر ختم ہوئی تو سننے والوں پر سناٹا طاری تھا۔ کتنی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

میرا اتنا کہنا کافی تھا کہ میں تمہارے ابو کو غائبانہ جانتا ہوں۔ ایک مشہور پاکستانی صحافی کی حیثیت سے اور ایک ناول نگار کی حیثیت سے (مصنف ملاح) بس میں شومی کے لیے اب انکل تھا۔ اس نے چلتے چلتے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔ شومی قیصر' ٹی وی کی ڈرامہ آرٹسٹ۔ تاکید کی کہ جب کبھی ڈھاکہ آنا ہو' ہم سے ضرور ملیں۔

مجھے اگر ذرا بھی گمان ہوتا کہ میرے لیے ڈھاکہ جانے کا بہانہ نکل آئے گا تو میں وہ کارڈ سنبھال کر رکھتا۔

''پنا قیصر اب پارلیمنٹ کی ممبر ہیں۔ مصروف بہت رہتی ہیں۔'' فریدہ اختر بتانے لگی' پھر اچانک اٹھی۔ جا کر فون کا ڈائل گھمایا۔ بنگلہ میں کچھ باتیں کیں' پھر مجھے بلایا ''لیجئے' بات کیجئے۔''

''کس سے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پنا قیصر سے۔''

میں شرمندگی کا اظہار کر رہا ہوں کہ آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی اور صبح میں جا رہا ہوں اور وہ کہہ رہی ہیں ''مجھے آج ہی شومی نے بتایا۔ اس نے آپ کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔''

پھر وہی تاکید کہ اب کے آپ ڈھاکہ آئیں تو ضرور ملیں میں پھر شد و مد سے وعدہ کرتا ہوں۔

اور ہاں قیصر نے 1971ء کے ڈھاکہ کا جو خون آشام نقشہ کھینچا تھا' وہ یہاں آ کر میں نے اس میوزیم میں دیکھا جو بنگلہ دیش

نے یہ سوچ کر قائم کیا ہے کہ مبادا وہ اپنی تاریخ کے اس خونیں باب کو فراموش کر دیں۔ اس وقت کی کھینچی گئی تصویریں یہاں آویزاں ہیں۔ ہر تصویر اس وقت کی المناک کہانی اس طرح سناتی نظر آتی ہے کہ 1947ء کے فسادات کی وحشت و بربریت اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

اگلے دن سیمینار میں میرے برابر ایک نیا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ باہمی تعارف ہوا۔ وہ تاریخ کے آدمی تھے اور اس ریسرچ سنٹر کے ڈائریکٹر جو بنگلہ دیش کی تحریک کے عوامل و محرکات اور واقعات و حادثات کی تحقیق کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے اس میوزیم کے بارے میں پوچھا۔

''جی ہم کل ادھر گئے تھے۔'' پھر میں نے مناسب لفظوں میں اپنے افسوس اور دکھ کا اظہار کیا' تامل کیا۔ پھر کہا ''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا؟''

''اسی میوزیم کے ایک گوشے میں 1940ء کے اس جلسہ لاہور کی بھی تصویر آویزاں تھی جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ وہ اکیلی تصویر ان تصویروں کے بیچ عجب سی لگتی ہے۔''

اس پر وہ چپ رہے۔ میں نے تامل کیا۔ پھر کہا ''اگر یہ تصویر یہاں آویزاں ہے تو پھر ایک اور تصویر بھی یہاں آویزاں کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس وقت کی تصویر جب برصغیر کے مسلمان زعماء 1906ء میں اسی شہر میں اکٹھے ہوئے تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی تھی۔ پتہ چلنا چاہیے کہ جس تاریخ کا یہ انجام ہے' اس کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا تھا۔ وقت کی بوالعجبی۔ آغاز کیا تھا' انجام کیا ہوا ہے۔''

وہ رکے' پھر سرسری بولے کہ ''وہ تصویر اب کہاں محفوظ ہے؟'' اور پھر ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔

ڈھاکہ سے ہماری رخصتی کی صبح آن پہنچی۔ صبح ہی صبح غلام محمد کی ہمراہی میں شوکت عثمان آن پہنچے۔ لیجئے ان سے تو ملاقات ہو گئی۔ سب پاکستانی ہم عصروں کو یاد کیا۔ ایک ایک کو سلام کہا' خدیجہ مستور کو بھی۔

''خدیجہ مستور کو میں آپ کا سلام کیسے پہنچاؤں گا؟''

''کیوں نہیں پہنچاؤ گے؟''

''کتنے برس ہو گئے' انہیں دنیا سے سدھارے ہوئے۔''

''اچھا؟ یہ واقعہ گزر گیا اور یہاں ہمیں معلوم ہی نہیں۔''

میں واپس آ کر آہستہ آہستہ ان کے ہم عصروں کو ابھی ان کا سلام پہنچا رہا تھا کہ ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ غلام محمد کے سدھار جانے کی بھی خبر پڑھ لی۔

لو میں کدھر نکل گیا۔ ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ناصر بنگال کی دھرتی سے کتنا اثر لے کر آیا تھا۔ پھر جب فوجی ایکشن شروع ہوا اور نوبت علیحدگی تک پہنچی تو اس بیچ اس نے کس درد سے اس سرزمین کو یاد کیا

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیروں کی
اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی

یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر
یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں پر
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر
وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ دل میں کھبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے

بس اسی لہجہ میں بولتے بولتے اس نے آنکھیں موند لیں اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔

ناصر گیا تو ناصر کے پیچھے پیچھے کئی اور شاعر چلے گئے۔ بس ہفتے ہی کے اندر اندر باقی صدیقی گئے' یوسف ظفر گئے۔

مگر مجھے ان کے سوا ایک اور موت یاد آ رہی ہے جو تھوڑے وقفہ کے بعد ہوئی۔ استاد امانت علی کی موت۔ اور اس موت سے شاید چھ سات دن پہلے کی ایک ملاقات۔ شام کو میں ٹی ہاؤس گیا تو دیکھا کہ استاد امانت علی آئے بیٹھے ہیں اور سخت غصے میں ہیں۔

''انتظار صاحب' میں ایک پریس کانفرنس کرنے والا ہوں۔ آپ کو اس میں آنا ہے۔

''حاضر ہوں گا۔ مگر پریس کانفرنس کس تقریب میں۔''

''بس میں یہ ملک چھوڑ رہا ہوں۔''

''خیر تو ہے۔''

''یہ لوگ میرے فن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں پریس کانفرنس میں اعلان کر دوں گا اور ملک سے نکل جاؤں گا۔''

''کون لوگ۔''

''یہ پی ٹی وی والے۔ کہتے ہیں کہ غزلیں گاؤ' ترانے گاؤ۔ میں کہتا ہوں' اور میرا محبوب راگ باگیشری' خیال' جے جے ونتی۔ اس پر انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تو میرا فن تو مر جائے گا۔ میں پریس کانفرنس میں یہ بتاؤں گا۔''

بس یہ کہتے کہتے استاد اٹھے اور تیزی سے نکل گئے۔ میں سمجھا کہ یہ وقتی غصہ تھا۔ شاید نشہ چڑھ گیا تھا۔ اتر جائے گا۔ مگر موسیقار بات کا پکا نکلا۔ سچ مچ ملک چھوڑ گیا۔ اور گیا بھی کون سے ملک ۔۔۔۔۔۔۔ ملک عدم۔

مگر یہ اکیلے امانت علی خاں کا المیہ نہیں تھا۔ ان دنوں سب ہی پکا گانے والے مشکل حالات سے دو چار تھے۔ وہ جو ابھی ذکر تھا کہ افتخار جالب نے راگ درباری کو اور اس واسطے ساری کلاسیکی موسیقی کو درباروں کی یادگار اور زوال پسندی کی نشانی بتایا تھا وہ ایک فرد کی رائے نہیں تھی۔ اس وقت کے انقلابی ٹولہ کا نقطہ نظر یہی تھا۔ عوامی موسیقی' عوامی آرٹ' عوامی ادب' یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو انہوں نے جانا کہ اب اس تصویر کو روبعمل لانے اور ثقافتی انقلاب برپا کرنے کا سنہری موقع مہیا ہو گیا ہے۔ اصل میں اس وقت انقلابی دانشور بہت اونچی ہواؤں میں تھے۔ ہم ایسے کالے آدمیوں سے بات ہی نہیں کرتے تھے۔ سمجھ رہے تھے کہ انقلاب آ چکا ہے۔ یہ تو آگے چل کر کھلا کہ بھٹو صاحب کتنے انقلابی اور کتنے عوامی ہیں۔ بہر حال اقتدار کے شروع کے دنوں میں تو ان کا یہ امیج برقرار تھا' ہر چند کہ نیو کیمپس ہال کے بھرے جلسہ میں حسین نقی کا ان سے مچیٹا ہو چکا تھا۔ اور وہ تو یہ کہئے کہ اللہ نے بھٹو صاحب کے دل میں نیکی دی کہ انہوں نے پولیس کو تنت وقت پہ روک دیا ورنہ اس عزیز کی مشکیں تو کسی گئیں تھیں۔

بہرحال ثقافتی معاملات میں تو انقلابی گروہ کی لائن اچھی خاصی چلی۔ خاص طور پر عوامی موسیقی کا سلوگن اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ انہیں دنوں الحمرا آرٹ کونسل کی چیئرمینی سے جسٹس رحمن رخصت کئے گئے تھے۔ اب اس کرسی پر انور سجاد رونق افروز تھے۔ چھوٹتے ہی ایک پریس کانفرنس بلائی اور عوامی موسیقی کے فروغ کا ایک پورا منصوبہ پیش کر ڈالا۔ میں نے بصد ادب اس عزیز سے پوچھا کہ اس منصوبے میں روشن آراء بیگم اور نزاکت علی سلامت علی کے لیے بھی کوئی جگہ ہے۔ اس نے رعونت سے جواب دیا کہ دیکھیں گے۔

اس پر استاد امانت علی خاں کا ردعمل تو آپ نے دیکھ لیا۔ روشن آراء بیگم کی بھی سن لیجئے۔ ان کا ایک مراسلہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ 14 اگست 1972ء کو پی ٹی وی پر ایک پروگرام پیش ہوا جس میں فیض صاحب، صادقین اور روشن آراء بیگم نے شرکت کی تھی۔ مت پوچھئے کہ صادقین نے کیا کہا اور فیض صاحب نے کیا فرمایا۔ مجھے زیادہ ہمدردی روشن آراء بیگم سے تھی جو لگتا تھا کہ اس پروگرام میں آ کر پھنس گئی ہیں۔ گفتگو بھی تشنہ، گانا بھی تشنہ۔ ایسا کیوں ہوا۔ انہی سے سنئے۔

لالہ موسیٰ

17 اگست 1972ء

محترم جناب انتظار حسین صاحب۔ سلام مسنون!

مزاج گرامی۔ آج میں نے روزنامہ ''مشرق'' میں آپ کا ''لاہور نامہ'' پڑھا۔ اس میں آپ نے میرے متعلق یہ بات بالکل درست فرمائی ہے کہ میں تو صرف موسیقی کی زبان جانتی ہوں کیونکہ میں ایک موسیقار ہوں اور ادیب اور مقرر نہیں ہوں۔ پھر بھی آپ کی اطلاع کے لیے میں ان حالات اور مجبوریوں کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں جو اس انٹرویو اور ٹھمری کے وی ٹی آر کے تیار کرنے میں پیش آئیں۔

مجھے اگست کے پہلے ہفتے میں راولپنڈی ٹیلی ویژن والوں نے کچھ ترانے ریکارڈ کرانے کے واسطے دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مجھے ایک ٹھمری بھی گانا ہوگی جو ایک انٹرویو اور ٹھمری پاکستان کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر 14 اگست کو دکھائی جائے گی۔

راولپنڈی پہنچنے پر مجھے مندرجہ ذیل سوال دیئے گئے جس پر میں نے اظہار خیال کرنا تھا۔

1- پاکستان میں کلاسیکی موسیقی اور اس کا مستقبل؟

2- کیا کلاسیکی موسیقی ہمارے موجودہ زمانے کے تقاضے پورے کر سکتی ہے؟

دراصل جو صاحب کراچی سے میرا انٹرویو لینے آنے والے تھے وہ 10 اگست تک راولپنڈی نہ آ سکے۔ انٹرویو ویسے یہ مذکورہ دو

سوالوں کی روشنی میں ریکارڈ کرلیا گیا۔ گو مذکورہ سوالوں میں یہ ذکر نہیں تھا کہ گزشتہ پچیس سالوں میں موسیقی نے کیا ترقی کی اور موسیقار کا اس میں کتنا حصہ ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی آل پاکستان میوزک کانفرنس لاہور کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ جہاں عوام پچیس سال پہلے کلاسیکی موسیقی سننے سے گھبراتے تھے اب اس فن کو دلچسپی سے سنتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے آل پاکستان میوزک کانفرنس کی سالانہ محافل موسیقی کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جن میں ہزاروں عوام شریک ہو کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میرے انٹرویو کے اختتام پر میں نے پانچ منٹ کی ٹھمری بھی گائی تھی مگر جب 14 اگست کو میں نے اپنا وی ٹی آر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انٹرویو اور ٹھمری میں خاصی کاٹ چھانٹ کر دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بمشکل میں ٹھمری کے بول ہی کہہ پائی تھی اور انترہ شروع بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وی ٹی آر ختم ہو گیا۔

اب آپ خود انصاف فرمائیں کہ مذکورہ حالات میں میں اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ سمع خراشی کی معافی چاہتی ہوں۔

فقط

آپ کی خیر اندیش۔۔۔۔۔۔۔روشن آراء بیگم

انٹرویو میں کاٹ چھانٹ تو ہونی ہی تھی۔ یہ بیان کہ ہزاروں لوگ کلاسیکی موسیقی کی محفل میں شریک ہوتے ہیں ٹی وی کی انقلابی پالیسی کو وارا نہیں کھاتا تھا۔

اور حلقہ ارباب ذوق انقلاب کو کیسے چلا رہا تھا وہ بھی سن لیجئے۔ ناصر کاظمی کا انتقال ہو گیا تو حلقہ ارباب ذوق نے تعزیتی جلسہ کیا۔ خیر یہ تعزیتی جلسہ تو حلقہ کے پرانے اراکین کے کہنے سننے سے کسی طرح ہو گیا مگر اگلے ہی ہفتے جو تعزیتی جلسہ ہونا تھا، وہ نہ ہو سکا۔ خیر میں تو وہاں نہیں تھا۔ میں اور مشتاق حلقہ کی رکنیت کو تیاگ چکے تھے اور سیکرٹری کو اپنا تحریری استعفیٰ بھیج چکے تھے۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر خبر سنی۔ اصل میں ناصر کے انتقال کے دوسرے تیسرے دن ہی پنڈی سے یوسف ظفر کے انتقال کی خبر آ گئی۔ یوسف ظفر حلقہ کے پرانے رکن۔ ان اراکین میں سے جن کے نام سے حلقہ جانا جاتا تھا۔ حلقہ میں تعزیتی جلسہ کا سوال اٹھنا ہی تھا۔ انقلابیوں کی ٹولی بگڑ گئی۔ کیا حلقہ اسی لیے رہ گیا ہے کہ رجعت پسند ادیبوں کے تعزیتی جلسے کرتا رہے۔ استدلال خوب تھا۔ شاید ان کے حساب سے بہت صحیح تھا۔ انقلاب پہلے ہی ناصر کے تعزیتی جلسہ کی وجہ سے ایک ہفتہ لیٹ ہو گیا تھا۔ یہ دوسرا تعزیتی جلسہ بھی ہو جاتا تو انقلاب دو ہفتے پیچھے جا پڑتا۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر انقلاب میں اتنی تاخیر مگر پھر ہوا کیا۔ انجم رومانی بھرا کھا کر جلسہ سے اٹھے۔ ان کے ساتھ حبیب جالب اٹھے، شہرت بخاری اٹھے، سلیم شاہد اٹھے۔ ٹی ہاؤس میں آ کر اعلان کیا کہ اصلی حلقہ تو ہم ہیں۔ یوسف ظفر کی یاد میں چائے کی میز پر بیٹھ کر تعزیتی جلسہ کیا۔

اگلی اتوار تک آتے آتے حلقہ کے نئے رنگ سے بیزار کتنے اراکین اکٹھے ہوئے۔ اپنے تئیں اصلی حلقہ کی تجدید کی۔ سہیل احمد خان سیکرٹری بنے۔ ایک نووارد نوجوان کہ ڈھاکہ سے بہہ کر لاہور آن نکلا تھا' جوائنٹ سیکرٹری بنا۔ نام اس کا سراج منیر تھا۔ ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں جلسہ ہوا۔ لیجیے حلقہ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کسی بھلی گھڑی میں کسی نے کیا خوب کہا تھا

حلقہ کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا انجم رومانی یا زاہد فارانی

زاہد فارانی تو برائے بیت تھا۔ یہ مقام اصل میں شروع سے انجم رومانی سے منسوب چلا آتا تھا۔ سو دیکھو کیسے وقت میں کیا کام دکھایا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ انقلابی جھنڈا الگ' حالی کی دکان الگ

''مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر''

گاہکوں کو خبر ہوتے ہوتے ہوئی۔ ٹی ہاؤس میں حلقہ کے یاران کہن اور یاران نو اکٹھے ہوتے چلے گئے۔ میں بھی وہاں آنے جانے لگا۔ دونوں حلقوں میں امتیاز اس طرح قائم ہوا کہ نئے قائم ہونے والے حلقہ کو حلقہ ارباب ذوق ادبی کہا جانے لگا۔ جس حلقہ سے بغاوت کی گئی تھی' وہ حلقہ ارباب ذوق سیاسی کے نام سے مشہور ہوا۔

قائدین بغاوت جنہوں نے حلقہ ارباب ذوق ادبی قائم کیا' دو تھے۔ انجم رومانی اور حبیب جالب مگر یہ تو اجتماع ضدین تھا۔ آخر کیسے ہوا؟ بس یہ حالات کی بوالعجبی تھی۔ انقلابیوں میں کھرا انگ تو حبیب جالب ہی تھا۔ باقی تو سب دانشوروں اور ادیبوں کے انقلاب میں تھوڑا تھوڑا کھوٹ ملا ہوا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ حلقہ میں بیٹھے ہوئے باقی انقلابیوں کی مرغی تو خالی کیمپ میں کڑکڑاتی تھی۔ حبیب جالب کی عوامی شاعری کا طوطی پورے ملک میں بولتا تھا مگر مقدر کا کھیل کہ پھر بھی حبیب جالب کو عزیز الحق اور اس کے حواریوں کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا۔ بات یہ ہے کہ انقلاب کے قبلہ کا بھی تو بٹوارہ ہو گیا تھا۔ انقلابیوں کے دو برانڈ چل رہے تھے۔ چینی برانڈ اور روسی برانڈ۔ ان دنوں چینی برانڈ کا شور زیادہ تھا۔ روسی برانڈ کو انہوں نے ترمیم پسند کہہ کہ مطعون کیا اور یہ ان کے شور کا کمال تھا کہ ترمیم پسند بھی رجعت پسند کی قسم کی ایک گالی بن گئی۔ حلقہ میں چینی برانڈ کا زور تھا۔ نتیجہ یہ کہ رجعت پسند انجم رومانی اور ترمیم پسند حبیب جالب مشترک دشمنوں کے مقابلہ میں متحد ہو گئے۔ یہ اتحاد مومنین حلقہ کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ حلقہ ارباب ذوق ادبی کامیابی سے چلتا رہا۔

سراج منیر جیسا کہ میں نے ابھی بتایا' اس حلقہ کا نائب سیکرٹری بنا تھا' سمجھو کہ اس جوان عزیز نے حلقہ ارباب ذوق ادبی سے آغاز کیا مگر جلد ہی آگے نکل گیا۔ ذہن براق پایا تھا' قلم تیز چلتا تھا۔ قلم بھی اور زبان بھی۔ زبان بے عیب' بیان شستہ' لہجہ دلنشین مگر یہ خوبیاں آدمی کو اچھا مقرر بنا سکتی ہیں۔ ادب اس کے سوا بھی کچھ مانگتا ہے تو اصل جوہر سراج منیر کا اس وقت کھلا جب اس نے تنقیدی مقالے لکھے۔

جب ربط وضبط بڑھا تو اس کے کچھ اور گن بھی سامنے آئے۔ مجھے ان دنوں گردے کی تکلیف تھی۔ ایک روز دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سراج منیر ہاتھ میں ایک شیشی لیے کھڑا ہے۔ کہا کہ اس کے دس قطرے پانی میں ملا کر روز صبح کو پی لیا کریں۔ انشاءاللہ گردے کے سلسلے میں اس کے بعد کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ کیسی دوا ہے؟ کس حکیم نے تجویز کی ہے؟ پتہ چلا کہ موصوف خود ہی حکیم ہیں۔ ہومیوپیتھی میں درک رکھتے ہیں۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ اس نے میرا ہاتھ دیکھا اور بہت کچھ بتا ڈالا۔ پھر زائچہ بنانے کا وعدہ کیا۔ دوسرے تیسرے دن ملاقات ہوئی تو زائچہ ہاتھ میں تھا۔ پتہ چلا کہ دست شناسی سے آگے بڑھ کر علم نجوم کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔

پھر ایک روز گھر پہ ملاقات کے دوران میں نے دیکھا کہ یہ عزیز عالیہ کو دعائیں لکھ کر دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ کسی پر جادو کیا گیا ہو تو اس کا توڑ کس کس دعا سے کیا جا سکتا ہے۔ کچھ دعائیں بتائیں۔ ایک تعویز لکھ کر عنایت کیا۔

ادب، ہومیوپیتھی، فراست الید، علم نجوم، جادو ٹونے، تعویز گنڈے اور ادو وظائف۔ میں حیران کہ اس جاتہار کا قدم کہاں کہاں ہے مگر ابھی تو کچھ اور گن سامنے آنے تھے۔ ایک روز گرمی کھائی، حلقہ کی کاروائی کا رجسٹر پٹخ کر پھینکا اور یہ جا وہ جا۔ ٹھیک بھی تھا، عزائم بلند تھے۔ حلقہ سے بندھائی ہاؤس میں نکا کب تک بیٹھا رہتا۔ تھوڑے دنوں بعد پتہ چلا کہ جوہر شناس مل گیا۔ اب جنرل ضیاء کا منظور نظر ہے۔

انہیں دنوں یہاں ایک اور ستارے کی نمود ہوئی۔ حلقہ کی روایت چلی آتی تھی کہ شاعر ایک چیز پیش کرے گا، خواہ غزل ہو خواہ نظم مگر اس شاعر نے اپنی دس غزلوں کے ساتھ اپنی مہورت کی۔ کیا غزلیں تھیں کہ مہورت ہی پر ہنگامہ ہوگا۔

چڑیا دھنے ہوا میں چاند
بے کل بالک وا میں چاند
چڑیا بالک ہونٹ کی بیٹی
اڑتا شجر صبا میں چاند
جدا سمندر سے چاند سوتا
بدن سمندر کی حس بنا جب
سوئے سورج کی نسل کا لحہ

بوئے راتوں میں اب پرندہ سیہ
آہٹ پھرے ہے پلوں سے دور دور
دریا سراغ ڈھلتا موجود سے دور دور
آواز کو عبث ہے گفتار کا اندھیرا
رفتار کو جلا ہے آنکھوں سے دور دور

سامعین حیران و پریشان جیسے ان کی مت ماری گئی ہو۔ تھوڑی دیر تک سناٹا طاری رہا۔ پھر اچانک مختلف سمتوں سے آوازیں آئیں اور ایک ہی سوال کیا گیا کہ کیا یہ غزلیں تھیں۔ اگر غزلیں تھیں تو ان کا کچھ مطلب بھی ہوگا' وہ کیا ہے؟ مطلب عنقا نظر آیا۔

مگر اس شاعری کے حامی بھی موجود تھے۔ ایک نے دفاع کرتے ہوئے معترضین پر ہلہ بول دیا۔ ''صاحب شاعری بھی کوئی بھینس ہے کہ اس سے دودھ ضرور دوہا جائے۔ مطلب نہیں ہے تو نہ سہی' شاعری تو ہے۔''

دوسرے حامی نے زیادہ مثبت انداز میں دفاع کیا۔ کہا کہ ''ان غزلوں سے مطلب اسی طرح برآمد ہوتا ہے جیسے بھرے تھنوں والی بھینس سے دودھ برآمد ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ آدمی دودھ دوہنا جانتا ہو۔''

یہ تھے صلاح الدین محمود۔ آدمی بھی نرالا' شاعر بھی نرالا۔ دراز قامت' گوری رنگت' بھرا بھرا جسم' لباس وہی ایک کرتا پاجامہ۔ رنگ اس کا کبھی گیروا' کبھی سفید اور ہمیشہ یہ شان کہ جیسے ابھی استری کر کے پہنا گیا ہے۔ بے شک اسے پہنے صبح سے شام ہوگئی ہو۔ لباس میں کبھی شکن نہیں دیکھی گئی۔ رات کو سو کر صبح کو اٹھے تو بھی لباس ویسا ہی صاف اور شکن سے پاک۔ داغ دھبہ نہ کبھی لباس پر دیکھا گیا نہ شخصیت پر۔ شخصیت بھی ایسی کہ جیسے ابھی حوض کوثر سے دھل کر آئی ہے اور یہ کہ ایک غوطہ گنگا ندی میں دیا گیا ہے۔ علی گڑھ میں پلے بڑھے مگر طور اطوار سارے لکھنو والے۔ شائستگی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ شائستگی کے ساتھ بولنا' بات کرنا۔ والد گرامی پنجاب کی مٹی تھے۔ اس مٹی کی سوندھ کو انہوں نے علی گڑھ میں رہتے ہوئے آخری وقت تک برقرار رکھا مگر صلاح الدین محمود نے ہمیشہ اپنے آپ کو علی گڑھ کی مٹی جانا۔

علی گڑھ والے ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ ہم سب ہی نے انہیں دیکھ رکھا ہے۔ علی گڑھ بھی تھوڑا بہت دیکھا ہی ہے مگر یہ علی گڑھ والا نرالا تھا۔ جس علی گڑھ کی جھلک دکھاتا تھا' وہ علی گڑھ بھی نرالا تھا۔ زبان نرالی' امیجری نرالی' چاند' اسپ سیاہ' نقش اول' نابینا طائر' شجر۔ یہ اس کے کلیدی لفظ اور ترکیبیں ہیں کہ بار بار ان کی نظموں میں ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ میں نے کہا کہ ''صلاح الدین آپ